

## رسائل و مسائل

## مسجد الاقصیٰ اور المسجد الاقصیٰ

جناب مولانا عبدالملک صاحب، ناظم شعبہ استفسارات - منصورہ - لاہور

**سوال :-** آپ کی خدمت میں ایک سوال بعینہ کرنا چاہتا ہوں جس کی غرض صرف علمی اور اپنے عقیدے کو درست کرنا ہے۔ میرا مطالعہ (مخصوصاً اسلام پر بہت محدود ہے) اس لیے آپ کو تکلیف دے رہا ہوں۔ آپ کا ماہنامہ تقریباً ایک عرصہ سے زیر مطالعہ رہا ہے جس کی افادیت پر روشنی ڈالنا اس کے علمی مہیار کو کم کرنے کے مترادف ہے۔ کچھ ہی دن ہوئے سیارہ ڈائجسٹ کا چودہ صدیاں زیر مطالعہ رہا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مضمون اولین مساجد میرے لیے حیرت انگیز ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے مسجد الاقصیٰ کے تعلق سے جو کچھ لکھا ہے اس کو میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

قرآن میں المسجد الاقصیٰ ہے اور حدیث میں مسجد الاقصیٰ دونوں ایک نہیں۔ مسجد الاقصیٰ مضاف المیہ ہیں اور المسجد الاقصیٰ صفت موصوف۔ دوسرے بخاری کے ہاں مسجد الاقصیٰ کا لفظ ہے۔ لیکن بخاری کے استاد ابو الیمان کی کتاب نیز صحیح مسلم میں اس کی جگہ مسجد ایلیا "کا ذکر ہے۔ بیت المقدس کو اسلام پہلے "ایلیا" کہتے تھے۔ بخاری کی حدیث میں ہرقل سے سفیر نبوی کی ملاقات بھی "ایلیا" میں بیان ہوئی ہے۔ جب عبدالملک بن مروان نے خلافت بنی امیہ میں اولیٰ قبۃ الصخرہ کی عمارت تعمیر کی تو اس نے اسے مسجد الاقصیٰ کا نام دیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب

نے بھی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ آپ کی لائبریری میں ضرور چودہ صدیاں نمبر ہوگا۔ آپ بھی اس کا مطالعہ کریں۔

میرے ذہن میں تین سوال ابھرتے ہیں:-

۱- حضور اکرم قبلہ اقل کی طرف جو نماز ادا کرتے تھے جب کہ کعبہ شریف کی طرف

نماز پڑھنے کے احکامات نہیں آئے تھے۔ کیا وہ یہی مسجد تھی؟

۲- معراج کے واقعہ میں حضور اکرم نے جو نماز انبیاء کے ساتھ پڑھی

تھی اور امامت بھی کی تھی کیا وہ یہی مسجد تھی؟

۳- حضرت عمرؓ نے بیت المقدس فتح کیا۔ حضرت بلال حبشیؓ نے جو اذان اس

وقت دی تھی، کیا وہی مسجد تھی؟

میں اپنی چند کتابیں اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تفسیر دوبارہ پڑھی، اور

سیرت سرورِ عالم میں معراج کے واقعہ کو دوبارہ پڑھا لیکن میری الجھن دور نہ ہو سکی۔

براہ کرم آپ میری اس الجھن کو ضرور دور کریں گے۔ اور مجھے آپ کے ادارہ سے بھی

قوی امید ہے کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے مضمون کے جواب میں ضرور علمی دلائل کے

ساتھ جواب دیں گے۔

**جواب:-** آپ کی توجہ دلانے پر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے مضمون کا مطالعہ کیا گیا۔ اس مضمون

میں ڈاکٹر صاحب نے مسجد اقصیٰ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو پڑھ کر واقعی ذہن میں وہ سوالات

پیدا ہوتے ہیں جن کا آپ نے اپنے خط میں ذکر کیا ہے۔ آپ کی طرح بہت سے دوسرے لوگ بھی اس

مضمون کے مطالعے کے بعد اس طرح کی الجھن کا شکار ہوئے ہوں گے اس لیے ڈاکٹر صاحب کے

مضمون کے متعلقہ حصے پر اظہارِ خیال کہنا ضروری خیال کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے مسجد اقصیٰ کے سلسلہ میں جو کچھ فرمایا ہے اس پر گفتگو کرنے سے پہلے ان کے

اپنے الفاظ میں اس کا ذکر کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں:-

”سورة اسراء میں معراج کا ذکر ہے۔ سبحن الذی اسوی بجدہ

لیلًا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ یعنی پاکی چلے اس

ذات تعالیٰ کے لیے جس نے اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد الحرام سے المسجد الاقصیٰ کا سفر کر لیا، المسجد الاقصیٰ کے لفظی معنی بہت دُور کی مسجد، جس شخص کو ساتوں آسمانوں سے بھی پر سے سدرة المنتہیٰ سے بھی مادہ دراد مقام قباب قومین تک پہنچایا گیا ہو تو اُسے جزیرہ نمائے عرب کے ہمایہ اور قریب ترین ملک یعنی بیت المقدس کی (جسے قرآن ہی نے ادنیٰ الارض قریب ترین سرزمین کا نام دیا ہے) عبادت گاہ لے جانے کا ذکر کرنا معقول نہیں معلوم ہوتا۔ ان علماء کا ذکر یہی درست معلوم ہوتا ہے جو کہتے ہیں کہ المسجد الاقصیٰ سے مراد قرآن مجید میں البیت المعمور یعنی فرشتوں کی مسجد ہے جو عرش بریں کے عین نیچے پائی جاتی ہے، اس پر بعض لوگ اعتراض کر سکتے ہیں کہ صحیح بخاری صحیح مسلم وغیرہ میں رسول اللہ کا فرمانا ہے کہ سواروں کو سفر کے لیے نہ کسا جائے بجز مسجد حرام (مکہ، مسجد نبوی، مدینہ) اور مسجد الاقصیٰ (بیت المقدس) کے۔ حدیث صحیح ہے لیکن اس سے ثابت کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایک تو اس حدیث میں مسجد الاقصیٰ کا ذکر (بخاری میں) ہے اور قرآن میں المسجد الاقصیٰ ہے۔ دونوں ایک نہیں، مسجد الاقصیٰ، مضاف مضاف الیہ میں اور المسجد الاقصیٰ صفت موصوف۔ دوسرے بخاری کے ہاں مسجد الاقصیٰ کا لفظ ہے، لیکن بخاری کے استاد ابو الیمان کی کتاب نیز صحیح مسلم میں اس کی جگہ "مسجد ایلیا" کا ذکر ہے..... جب عبد الملک بن مروان نے خلافت بنی امیہ میں وہاں قبۃ الصخرہ کی عمارت تعمیر کی تو اُس نے اسے مسجد الاقصیٰ کا نام دیا..... اُس وقت شاہوں کی تسلی اور دلہی کے لیے عبد الملک نے مسجد الاقصیٰ تعمیر کرائی اور اس کا حج شروع کرایا (جیسا کہ ابن کثیر نے تفصیل سے بیان کیا ہے) ان حالات میں سورہ امریٰ میں بیت المقدس کی مسجد کا ذکر ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔

گویا ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے نزدیک "المسجد الاقصیٰ" سے بیت المقدس کی مسجد مراد لینا معقول معلوم نہیں ہوتا۔ اور ان کے نزدیک اس نام کی مسجد اُس وقت دنیا میں موجود بھی نہیں تھی۔ بعض احادیث میں اگر اس نام کا ذکر آیا بھی ہے تو وہ "مسجد الاقصیٰ" کے الفاظ کے ساتھ آیا

ہے اور وہ بھی درحقیقت ”مسجد الیامیا“ کے لفظ کو مسجد الاقصیٰ سے بعد کے کسی راوی نے تبدیل کر دیا ہے۔ ورنہ فی الحقیقت اس نام سے کسی مسجد کا وجود اس وقت ہوا، جب عبد الملک بن مروان نے قبۃ الصخرہ کی عمارت تعمیر کر کے اس کا نام مسجد الاقصیٰ رکھا۔ گویا اُن کے نزدیک اس نام سے ایک مسجد کا وجود عبد الملک بن مروان کا دینِ سنت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا موقف علمی لحاظ سے کچھ بھی وزن نہیں رکھتا۔ اُن کا یہ فرمانا کہ ”سورۃ اسراء میں بیت المقدس کی عبادت گاہ تک لے جانے کا ذکر کرنا معقول معلوم نہیں ہوتا“ سچائے خود معقول نہیں ہے۔ اس سلسلے میں متعلق دلائل درج ذیل ہیں:-

۱۔ اسراء کے تمام مراحل میں سے ہر مرحلہ اپنے اندر ایک ذریعہ دست قسم کا اعجاز رکھتا ہے۔ اگر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے بیت المقدس اور اُس کے بعد ساتوں آسمانوں اور ان سے پرے سدرة المنتہیٰ تک لے جایا گیا ہے تو ضروری نہیں ہے کہ مسجد الحرام سے اس سفر کے آغاز، اور سدرة المنتہیٰ سے ماوراء، قاب قوسین پر اس سفر کے منتہیٰ ہی کو بیان کیا جائے اور سبحان الذی اسی بعد لا لیلاً من المسجد الحرام کے بعد الی قاب قوسین او ادنیٰ کہا جائے یا من المسجد الحرام الی سدرة المنتہیٰ کہا جائے یا من المسجد الحرام الی البیت المعمور کہا جائے اور اگر ایسا نہ کہا جائے تو وہ غیر معقول ہو کر رہ جائے۔

۲۔ قرآن پاک کی تفسیر کرتے ہوئے کسی لفظ کے معنی متعین کرنے کے سلسلے میں سامعین کے فہم کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے لہذا اس بات کو ملحوظ رکھنا ہو گا کہ اس کلام کے سامعین نے ”من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ“ کے الفاظ سے کیا مفہوم اخذ کیا ہو گا اور ان کے تصورات کے لحاظ سے المسجد الاقصیٰ کا کیا مفہوم ہو سکتا ہے۔ جب اس لحاظ سے ہم دیکھتے ہیں تو یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اہل عرب میں ”المسجد الاقصیٰ“ کے نام سے کوئی مسجد آسمانوں میں معروف نہ تھی۔ لہذا ”المسجد الاقصیٰ“ کا ایسا مفہوم نکالنا جس سے اہل عرب واقف ہی نہ ہوں غلط ہو گا۔ البتہ ڈاکٹر صاحب اگر اس طرح کسی مسجد کا تصور ”اہل عرب“ کے کلام سے پیش کر دیں تو اس سے ان کے موقف کو تقویت مل سکتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے

کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یہی مضمون بیان کرنا ہوتا جو ڈاکٹر صاحب اس آیت سے نہ کہنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے "سن الا لاس حنی الی السماء" کے الفاظ زیادہ موزوں، مناسب اور متبادر انی الفہم ہوتے نہ کہ "من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ"۔

۳۔ جب مسجد الحرام کے مقابلہ میں کسی مسجد کا ذکر آئے گا تو لازماً اس سے ذہن کسی ایسی مسجد ہی کی طرف منتقل ہوگا جو مسجد حرام کی طرح زمین پر ہو نہ کہ آسمان پر۔

۴۔ اگر قرآن پاک میں "المسجد الحرام" بیت المعمور کے لیے استعمال ہوا ہے تو بیت المعمور اس نام کے ساتھ بیت المقدس کے عبادت خانہ سے زیادہ معروف ہوتا۔ لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ "مسجد اقصیٰ" یا "المسجد الاقصیٰ" کا لفظ سن کر کسی علم و غیر مسلم کا ذہن "بیت المعمور" کی طرف منتقل ہونے کی بجائے "بیت المقدس کے عبادت خانہ" کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ماننا پڑے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جس مقام کے لیے "المسجد الاقصیٰ" کا لفظ استعمال

کیا ہے وہ تو نہ چل سکا اور عبد الملک بن مروان نے جس مقام کے لیے اس لفظ کو استعمال کیا، وہ راجح ہو گیا۔ کیا یہ چیز قابل تسلیم ہے؟ کوئی بھی شخص جو معمولی فہم و ادراک رکھتا ہو قرآنی نام کے عدم رواج اور عبد الملک بن مروان کے نام کے رواج پا جانے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔

۵۔ لفظ اقصیٰ کے معنی بقول ڈاکٹر صاحب "بہت دور کی مسجد" کے ہیں۔ لیکن تعجب

ہے کہ ڈاکٹر صاحب "الحنی الی السماء" قریب ترین سرزمین اور "بہت دور کی مسجد" میں منافات سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ قریب ترین سرزمین کی بجائے "خود اپنی سرزمین" میں بلکہ اپنے شہر میں بھی ایک مسجد کو "المسجد الاقصیٰ" کہا جاسکتا ہے۔ جب ایک شہر میں ایک محلے کے لحاظ سے تمام مساجد کو دیکھا جائے تو کسی ایسی مسجد کو جو اس محلے میں سب سے زیادہ دور ہوگی، "المسجد الاقصیٰ" کہنا بالکل درست ہوگا۔ اس لیے کہ اس ترکیب میں خود مسجد کو دور قرار دیا گیا ہے۔ دوری مسجد کی صفت ہے نہ کہ اس ارمن کی جس میں وہ مسجد واقع ہے۔

مسجد اقصیٰ کو مسجد حرام کی نسبت سے اس لیے اقصیٰ کہا گیا ہے کہ مسجد حرام کی نسبت جن اہم مساجد کے ساتھ ہے ان میں سے یہ مسجد ان سب کی بہ نسبت زیادہ دور ہے۔ "وقال غیر واحد انہ مسمیٰ بطلانہ ابعد المساجد التي تزار من المسجد الحرام"

دبیتنہما نحر من اربعین لیلۃ“ متفقہ علماء نے اس کی وجہ یہ بیان کی جن مساجد کی زیارت کی جاتی ہے، ان سب میں یہ مسجد حرام سے زیادہ دُور ہے، دونوں کے درمیان چالیس دن رات کی مسافت ہے۔ (روح المعانی جلد ۱۵ صفحہ ۹)۔

۶۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کا ایک ہی معنی بیان کیا ہے، بہت دُور کی مسجد“ حالانکہ اس کے اصل معنی دوسری مسجد سے بڑھ کر دُور کی مسجد کے ہیں۔ اور اس اصل معنی کے لحاظ سے مسجد حرام سے کئی مساجد کا مقابلہ مان کر ان میں بیت المعمور کو شامل کر کے اُسے ”اقصی“ کہنا پڑے گا۔ کیا اس بات کی ضرورت ہے کہ آسمان کی ایک مسجد کو زمین کی مساجد میں شامل کر کے اس کو ان کی بہ نسبت مسجد حرام سے اقصیٰ قرار دیا جائے؟

۷۔ ”مسجد اقصیٰ“ کا ایک معنی ”گندگیوں اور خباثت سے دُور“ بھی کیا گیا ہے اور اسی معنی کے لحاظ سے اسے بیت المقدس بھی کہا جاتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ قرآن پاک میں اسے اسی لحاظ سے ”المسجد الاقصیٰ“ کہا گیا ہو، اور سرے سے وہ اشکال ہی نہ پیدا ہو جس کو بنیادینا کہ ڈاکٹر صاحب ”مسجد الاقصیٰ“ کے متعارف معنی کو چھوڑ رہے ہیں۔

۸۔ یہ بات اُمت میں تو اتنے سے چلی آرہی ہے کہ بیت المقدس میں جو عبادت خانہ ہے اُس کا نام مسجد اقصیٰ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ میں معروف تھا۔ آج تک کسی ایک عالم فقیہ، مؤرخ یا کسی عام مسلمان نے اس میں شک نہیں کیا اور اسی بنیاد پر اُمت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ سورۃ اسراء میں ”معراج“ کے جس حصے کو نقل کیا گیا ہے وہ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ (بیت المقدس کے عبادت خانہ) تک تو قطعی طور پر قرآن پاک سے ثابت ہے، رہے معراج کے دوسرے مراحل تو ان کی حیثیت اس قدر قطعی نہیں ہے جس قدر اس مرحلہ کی ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں ”ومن هنا قالوا الاسراء الى بيت المقدس قطعی ثبت بالكتاب فمن انكره فهو كافر والمعراج ليس كذلك فمن انكره فليس بكافر بل مبتدع“ (روح المعانی جلد ۱۵ ص ۱۳)

اس وجہ سے علماء نے کہا ہے کہ بیت المقدس تک کا اسراء قطعی ہے کتاب سے ثابت ہے جو اس کا انکار کرے وہ کافر ہے اور معراج کی حیثیت یہ نہیں، اس لیے اس کا منکر کافر نہیں بلکہ

مبتدع ہے)۔

مسجد اقصیٰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "وهو احد المساجد الثلاث التي تشد اليها الرحال والاربع التي يمتنع من دخولها الدجال" (وہ ان تین مساجد میں سے ایک ہے جن کی خاطر سفر کیا جاتا ہے اور ان چار میں سے ایک ہے جن میں دجال کا داخلہ نہیں ہو سکے گا)۔ (روح المعانی جلد ۱۵ ص ۹)

مزید فرماتے ہیں: "وهو ثانی مسجد وضع فی الارض لخبر ابی ذر قلت یا رسول اللہ ائی مسجد وضع فی الارض اقلا قال المسجد الحرام قلت ثم ائی قال المسجد الاقصیٰ قلت کہ بینہما قال اربعون سنة" (یہ دوسری مسجد ہے جو زمین میں بنائی گئی حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی روایت کی رو سے۔ فرماتے ہیں، میں نے کہا یا رسول اللہ کون سی مسجد سب سے پہلے بنائی گئی تو آپ نے فرمایا "المسجد الحرام"۔ میں نے عرض کیا پھر کون سی آپ نے فرمایا "المسجد الاقصیٰ"۔ میں نے عرض کیا دونوں کے درمیان میں کتنے عرصے کا فاصلہ تھا۔ آپ نے فرمایا چالیس سال کا)۔ (روح المعانی جلد ۱۵ ص ۱۱)

امام بخاری نے جو حدیث میں اجتہاد کے مرتبہ پر فرق نہیں۔ اسراء کی ان آیات کو مسجد حرام سے بیت المقدس تک کے سفر کے ساتھ خاص کرتے ہوئے اسراء کا الگ باب باندھ کر ان آیات کو اس کے تحت درج کیا ہے۔ اور معراج کا الگ باب باندھ کر اس کے تحت دوسری آیات کو نقل کیا ہے۔ ابن کثیر نے امام صاحب کے اس طریقہ عمل سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ان کے نزدیک میں بیت المقدس اور مسجد اقصیٰ تک کے سفر کا ذکر ہے۔ اور اس سلسلہ میں خود امام بخاری کا کتاب کا یوں حوالہ دیتے ہیں:-

"ثم قال البخاری عن عكرمة عن ابن عباس في قولنا الروياء التي اربيناك الاقتنة للناس قال هي روياء عين اسرى به الى بيت المقدس" (یہ روياء سمائی آنکھوں سے تھا اور بیت المقدس تک کی سیر سے اس کا تعلق ہے)۔ (الہدایہ والنہیہ جلد ۳ ص ۱۱۵ تا ۱۱۶)

امام رازی لکھتے ہیں:- "الی المسجد الاقصیٰ اتفقوا علی ان المراد منه بیت المقدس

سعی بالاقصى لبعده المسافة بينه وبين المسجد الحرام" (تفسیر البکیر جلد ۲۰ ص ۱۲۶ - مضموع طبران)۔

(علامہ نے بالاتفاق "المسجد الاقصى" سے بیت المقدس مراد لیا ہے اور اسے اقصیٰ کہنے کی وجہ سے مسجد حرام اور مسجد بیت المقدس کے درمیان مسافت کی دوری ہے)۔

عماد الدین ابن کثیر اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں "الى المسجد الاقصى هو بيت المقدس الذي بايلياء معدن الانبياء من لدن ابراهيم الخليل عليه السلام" (مختصر تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۵۲)۔

(مسجد اقصیٰ بیت المقدس ہے جو ایلیاء میں ہے جو ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں انبیاء کا مرکز تھا)۔ اس سلسلہ میں تمام روایات کو نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"واذا حصل الوقوف على المجموع هذه الاحاديث يحصل مضمون ما انفقت عليه من مسرى رسول الله صلى الله عليه وسلم من مكة الى بيت المقدس" (مختصر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۶۳)

(ان سب روایات سے جو مضمون متفقہ طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ آپ کا سفر مکہ سے بیت المقدس تک تھا)۔ اس کی تعمیر میں لکھتے ہیں:-

"قد كان بنى ايضا في زمن اسحاق ويعقوب عليهما السلام لكن بنيانه على التمام وكمال الهيئة كان على عهد سليمان عليه السلام" (ص ۳۵۲)

(اسحاق اور يعقوب عليهما السلام کے زمانہ میں بھی اس کی تعمیر کی گئی تھی لیکن پوری طرح مکمل شکل میں سليمان عليه السلام کے زمانہ میں اس کی تعمیر ہوئی)۔

ابن کثیر جن کے حوالہ سے ڈاکٹر حمید اللہ صاحب نے اُسے عبدالملک بن مروان کی تسمیہ کردہ مسجد قرار دے کر قرآن و حدیث میں اس کے ذکر سے انکار کیا ہے انہی ابن کثیر کے حوالے ہم نے درج کیے ہیں، ان کی روشنی میں یہ حقیقت از خود واضح ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی اختراع کو کس طرح ابن کثیر کے مضمون سے لے رہے ہیں۔

۹۔ ابن کثیر نے اتنا ضرور لکھا ہے اور یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ عبدالملک بن مروان نے



کئی مساجد کی تعمیر کی جن میں جامع دمشق بھی شامل ہے، جسے اپنے دور کے مسلم اور غیر مسلم تمام لوگوں نے ان کے ایک بہت بڑے اور بے نظیر کارنامے کے طور پر تسلیم کیا، جن میں قبۃ الصخرہ کی عمارت بھی شامل ہے۔ اور یہ بات بھی کسی حد تک درست ہے کہ اس کی تعمیر کردہ مسجد اقصیٰ نے لوگوں کو اپنی طرف کھینچا اور کچھ لوگوں نے اس کا طواف بھی کرنا شروع کر دیا۔ لیکن یہ بات قطعاً بے بنیاد ہے کہ اس کا نام بھی عبد الملک بن مروان نے رکھا تھا، جامع دمشق کے علاوہ مسجد نبوی کی تعمیر بھی عبد الملک اور ان کے بیٹے ولید نے کی، تو کیا اس سے یہ لازم آجائے گا کہ "مسجد نبوی" بنو امیہ کا رکھا ہوا نام ہے۔ اس طرح بیت المقدس کے ایک حصے کی تعمیر اگر عبد الملک بن مروان نے کر دی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آجاتا کہ مسجد اقصیٰ کا نام بھی انہی کا رکھا ہوا ہے۔ بلکہ ابن کثیر کے الفاظ تو اس بات کو صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ یہ نام تو پہلے سے تھا۔ عبد الملک نے صرف اتنا کیا کہ اس کی تعمیر کر دی۔ ابن کثیر لکھتے ہیں:-

"وفيه ابتداء عبد الملك بن مروان ببناء القبة على حفرة

بیت المقدس و عمارة الجامع الاقصی و کملت عمارتہ

فی سنة ثلث و سبعین" (البدایہ والنہایت ج ۸ ص ۲۸۰)

(اور اس سال عبد الملک بن مروان نے صخرہ بیت المقدس پر قبۃ اور جامع الاقصیٰ کی عمارت

کی تعمیر کا آغاز کیا اور اس کی تکمیل ۳۳ھ میں ہوئی)۔

۱۰۔ ڈاکٹر صاحب نے مسجد اقصیٰ اور مسجد الاقصیٰ میں جو فرق کرنے کی کوشش کی ہے۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اس میں ذرہ برابر بھی وزن نہیں ہے۔ مسجد الاقصیٰ اور المسجد الاقصیٰ میں معنوی

اعتبار سے کوئی بھی فرق نہیں ہے۔ مسجد الاقصیٰ بے شک لفظاً مضاف اور مضاف الیہ ہیں لیکن

معنی "موصوف صفت ہیں۔ اور عربی زبان کے قواعد کے لحاظ سے اس طرح کا تغیر عام بات ہے۔

موقع اور محل کے لحاظ سے موصوف صفت کو مضاف مضاف میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ

قرآن پاک میں المسجد الحرام آیا ہے۔ لیکن ایک حدیث میں "لا تشد الرحال الا الی

ثلاثة مساجد، مسجد الحرام و مسجدی هذا و المسجد الاقصیٰ" آیا ہے۔

(ابن ماجہ باب ماجاء فی الصلوٰۃ فی مسجد بیت المقدس)

کیا حدیث کے ان الفاظ کے پیش نظر یہ کہنا درست ہوگا کہ قرآن پاک میں المسجد الحرام آیا ہے لہذا اس حدیث میں مسجد الحرام سے کوئی اور مسجد مراد ہوگی، نہ کہ وہ جس کا سورہ اسراء میں ذکر کیا گیا ہے۔

۱۱۔ ڈاکٹر صاحب نے احادیث سے مسجد اقصیٰ کے ثبوت کو مشکوک بنانے کے لیے ایک تو مسجد اقصیٰ اور المسجد الاقصیٰ میں خانہ زاد فرق کیا ہے۔ دوسرا یہ کہ المسجد الاقصیٰ مسجد اقصیٰ اور "مسجد ایلیا" کے الفاظ کے اختلاف کا سہارا لے کر مسجد "ایلیا" کے نام کو ثابت اور مسجد اقصیٰ کے نام کو غیر ثابت قرار دے دیا، حالانکہ ایک چیز کے ایک سے زائد نام بھی ہو سکتے ہیں۔ اور سب کے سب صحیح بھی ہو سکتے ہیں۔ اور تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ بیت المقدس کا نام ایلیا بھی تھا۔ جس کا اصل معنی "بیت اللہ" کے ہیں۔ تو اس کے بعد بیت المقدس مسجد ایلیا اور مسجد اقصیٰ کے مختلف ناموں کے استعمال سے کسی ایک کی نفی کیسے ہو سکتی ہے۔

"قال الحافظ السہیلی قولہ عزوجل الی المسجد الاقصیٰ یعنی بیت المقدس وهو ایلیا معنی ایلیا بیت اللہ" (حافظ سہیلی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان "الی المسجد الاقصیٰ" سے مراد بیت المقدس ہے اور یہی ایلیا بھی ہے جس کے معنی "اللہ کا گھر" کے ہیں)۔ (حاشیہ محمد علی صابونی علی مختصر ابن کثیر جلد ۲ ص ۳۵۳)

۱۲۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر مشرکین نے واقعہ اسراء کے سلسلے میں جو اعتراضات کیے

ان سب کا تعلق باتفاق روایات بیت المقدس تک کے سفر سے تھا۔ بخاری و مسلم اور حدیث کی تمام صحیح اور درجہ شہرت کو پہنچنے والی روایات میں ان اعتراضات اور آپ کی پریشانی کا ذکر ہے یہ اعتراضات اس کے بغیر کیسے ممکن ہو سکتے تھے کہ آپ نے ان کے سامنے سورہ اسراء کی آیت تلاوت فرما کر اپنے سفر بیت المقدس کی خبر نہ دی ہو، گو یا کہ جملہ اہل لسان نے سبحان الذی اسما بی بعدہ لیلاً من المسجد الحرام الی المسجد الاقصیٰ سے بیت المقدس کا عبادت خانہ سمجھ کر آپ سے سوالات کیے اور آپ ان کے سوالات سے بہت پریشان ہوئے۔ تب اللہ تعالیٰ نے آپ کی صداقت ظاہر کرنے کی خاطر بیت المقدس کو آپ کے سامنے کر دیا اور آپ نے ایک ایک کر کے ان کے سوالات کے جوابات دیئے۔ "عن جابر

ابن عبد اللہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کذبتنی قریش حین  
اسری بی بی اُمی بیت المقدس قمت فی الحجر فجلی اللہ لی بیت المقدس  
فطفقت انہم عن آیاتہ وانا انظر الیہ (رواہ احمد والشیخان)  
فجعی بالمسجد وانا انظر الیہ (احمد، بیہقی، نسائی)۔

(جابر بن عبد اللہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جب مجھ بیت المقدس  
کی طرف لے جایا گیا اور قریش نے میری تکذیب کی تو میں عظیم "میں کھڑا ہو گیا اور اللہ تعالیٰ نے بیت المقدس  
کو میری نگاہوں کے سامنے روشن کر دیا تو میں دیکھ کر اس کی نشانیاں انہیں بتاتا گیا) اور احمد بیہقی نسائی  
کی روایت میں بیت المقدس کی جگہ "مسجد" کے الفاظ آئے ہیں۔ (مسند احمد، بخاری، مسلم)

۱۳۔ حقیقت یہ ہے کہ تواتر سے ثابت شدہ حقائق کو اس طرح کی بے حقیقت لفظی بحثوں سے  
جھٹلانا رواج پا جائے تو دنیا کی کوئی حقیقت بھی ثابت نہیں رہ سکتی۔ لڑاکر صاحب کی رائے ماننے  
کا مطلب یہ ہوگا کہ تمام فقہاء، محدثین، مؤرخین اور عامۃ المسلمین کو بنو امیہ نے دھوکہ دے دیا  
ہے۔ اور جو نام انہوں نے "مسجد ایلیا" کے لیے رکھا۔ اُس کو سب نے آنکھیں بند کر کے نبی صلی اللہ  
علیہ وسلم اور قرآن کا دیا ہوا نام سمجھ لیا۔ اور اُس زمانے میں کوئی اختلافی و احتجاجی رائے سامنے  
نہ آئی۔ البتہ صدیاں گزرنے کے بعد ایک دانشور ایسا نکل ہی آیا جو بنی امیہ کی اس چال کو عیاں پ  
گیا اور اُس نے یہ انکشاف کر ہی ڈالا کہ مسجد اقصیٰ کا نام بنو امیہ کے خاندان کے ایک فرد عبد الملک  
بن مروان نے رکھا تھا؟

پس لڑاکر صاحب کی یہ بات صرف اسی صورت میں قابل التفات ہو سکتی ہے جب وہ تاریخ  
سے اس بات کا صریح ثبوت پیش کریں کہ "مسجد اقصیٰ" کا نام عبد الملک بن مروان نے رکھا تھا اور  
ایسا کہنا جو لے شیر لانے کے مترادف ہے۔

احتیاط :- ترجمان القرآن میں ضرورت استہلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں  
قارئین سے گزارش ہے کہ جن اور ان پر آیات و احادیث ہوں ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ  
بے ادبی نہ ہونے پائے۔  
(۱۵۱)